

خالہ نے حیری تعلیم پر بڑی توجہ دی۔

خار لے میری نہاد صفر توں کا بڑے سیتے سے بنایا رکھا۔

اسی نئے آج میں یہاں اپنے تھوڑے پر کھڑا باتیں کرنے کے قابل ہوا ہوں لیکن بلی کو دو دھو کے علاوہ مس کی بھی صفر دت ہوتی ہے۔ اسے یہ احساس ہزور ہونا چاہئے کہ وہ کسی کیستے اہم ہے..... میری زندگی اس احساس سے عاری رہی۔ مجھے اس گھر میں اتنی اہمیت بھی حاصل نہ تھی جتنی دُکی میں بند پشی کی ہوا کرتی ہے..... کہ وہ ہو تو وافر لیکن اپنی صفر دت کے باعث سمجھتے ساتھ ساتھ رہے۔

میری تعلیم کے مراحل اور نو کرفی کے مدارج بے رنگ نوشکی ماند ہیں۔

یہ ساری منزلیں مجھے محنت کے ہاتھوں میں ملیے اعزاز، دُگر یاں، مدد سے جن پر میں فائز رہا، منزلیں نہیں تھیں، منزلوں کے سراب تھے۔ میری ہر کامیابی میں اس درجہ محنت پڑتی تھی کہ جب کامیابی اپنے لیکر آگے بڑھتی تو میں اس سے نظریں چرانے لگتا۔ مجھے کوئی ایسی خوشی یاد نہیں ہوئی تھی بلکہ باقیت میں ہو..... کبھی کبھی بیرونی خوف میں میں اتنی مرتبہ لگ جاتی ہے کہ اگر وہ دیوار پر چڑھ جی لے تو بھی انگوڑ کٹھے ہی رہتے ہیں۔

میں نے محبت کی تلاش میں بڑی ابتمانی کی۔ صحراء صحراء چلا۔ گم..... بظاہر فرعون صورت لیکن اندر سے کام پھیلاتے بڑی دشمن فروی کی لیکن اس دشمن میں ایسی آندھیاں چلتی ہیں کہ ٹھیک سے تم بھی نہیں جسمے پاتے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسان محبت کی تلاش میں نکلتا ہے، چلتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے ریگستان میں یہ آپ چیت تو نہیں ملتا۔ ہاں استانتے کو شہر کا خلستان مزول جاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسے ہی، ہوا.....!

نہ اجانے کس صدی میں کس بد نصیب شاعر نے شہر کی آرزو کی ہو گی۔ اس کی خوشی کا پارسل جانے کس صدی میں چلا اور مجھے جو محبت کے بہن ڈرافٹ کا منظر تھا اس کے ہاتھوں میں

آگیا۔ یہ بھی زندگی کا طرف نما شاتھا کہ دونوں میں میری غزلیں اخباروں رسالوں کی زینت بن گئیں۔ کسی نے ان میں تیر کا زندگانی کر دیا۔ کسی حید جو نے انہیں غائب سے مائل کر دیا۔ میں نے کبھی آرزوئہ کی تھی کہ میں سقراط کی مانند دوسروں کے ذہنوں کو اجال دوں لوگ مجھ سے بیاسی لفڑیاں افوق الطبعیاتی ہجنسی بولغمون نظروں کی اسی رنگ کے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے بامنی مر بوط افہما پر خیال کے متین میں۔ حالانکہ میں چاند کی دوستی میں قلم ڈالتا ہوں اور سمندر کی سطح پر کھتا ہوں۔ میں وہ تو سے کیا کوئی بکریے غریب سلطنتی ذہن سے تبارد لختا ہوں کیسا؟ میں تو کانگڑے کا بندہ ہوں جو رقی کے درختوں کی ہر رشی پر پسکا کرتا ہے اور جسے یہ معلوم نہیں ہو پائنا کہ رقی کی ہر رذائل اول و آخر ڈائل ہوتی ہے وہ خاص صفت میں بھلکتی ہے اور اس پر ایک خاص حد تک بوجھ ڈالا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ بک اند رہی اند رہی میرے کھوکھلے پن کو عکسوں کرتے ہوں لیکن اپنی میں مار سلفان کے اخہما رختا ہوں نہیں کہ سکتے کیونکہ جب کسی دلدار شہر کے متعلق ایک روایت جنم لیتی ہے تو پھر اس روایت کو توڑنے کے لئے جب تک اس سے بڑا فیقرِ شہر پیدا نہ ہو..... دلدار شہر کے مر پر رشی کا ہاں الٹوڑ رہتا ہے۔ سارے ہال میں خوش فہمی، خوش اعتمادی، خوش دل کا ارتقاش خوشبو کی طرح پھیلا ہے۔ اگر اس ارتقاش کو ہم کسی کپیوٹر سے جانچ سکتے تو بڑا ہی متوازی گراف بناتا جس کے اتار پر ٹھواڑے میں کچھ زیادہ تفاوت نہ ہوتا۔

ان خیالات کے باوجود میں بھے جارہا ہوں۔ بالکل اس کارکی طرح جو کھردی ہوتی ہے لیکن اس کا ذرا بیوڑا سے ریک دیتے ہم اتھے ۔ میں کہہ رہا ہوں۔

"انسانی بھائیلئے ہو اپانی سے کہیں زیادہ محبت ضروری ہے لیکن عام طور پر لوگ محبت کو پسند کر کانز لوز بخستے ہیں۔ وہ اسے اپنے سیف میں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ دل تقویز ہے جوان کھتنے میں دوسروں پر چلتا ہے۔ یہ دل جادو ہے بودہ دوسروں پر کرتے ہیں۔"

درachi محبت اپنی آرزوں کی تکمیل کا نام نہیں۔ محبت بڑھی ہوتی، استیلی نہیں ہے جو لوگ چلتے ہی ارزوں میں جلتے ہیں وہ ماکھی شکل میں پڑ گر پہنچتے ہیں اور جو اپنی محبت کو دوسروں

کے قدموں میں بچا دکرتے ہیں ان کی قبر پر مختدے آنسوؤں کی بارش ہوتی ہے اور بھار کے
دوں میں خود رکھاں کے ساتھ ساتھ خوش رنگ پھول بھی جنم لیتے ہیں۔

جب اپنے لوگ کا بچہ نسلکیں گے تو آپ سب کو خیال ہو گا کہ راجحے، کوہن، عینوں کی محبت
بانہیں کھو لے کھڑدی ہوں گے۔

..... لیکن محبت کے خواب صرف ان ہی کے پورے ہوتے ہیں جو اپنے لئے کچھ طلب نہیں
کرتے جو محبت کرتے ہیں۔ محبت مانگنے نہیں:
میرے کندھلاؤ درگدن رضاہم کے آنسو بیں۔
اور میرے بہنوں پر فریب کی باتیں ہیں۔

میں نے ساری عروانہ محبت کی اور اپنے لئے کچھ زمانگاہ میں اس اونٹ کی طرح اونٹ کیار
کے جبلک سے گزرا۔ جس بے اپنے منڈپ پھینکا بندھا ہو اور اب میری حالت اس ٹبھے کی طرح ہے جو
بورہنہ عورتوں کے جھرمٹ میں اپنا منہ اس لئے چھپائے ہیٹھا ہو کہ اس کی دلکشی کی جب وہ جماں
محبت کے قابل تھا۔

میں نے صائمہ سے ساری عمر محبت کی اور پلٹ کر ایک دن بھی اس سے اپنے لئے محبت کی بیک
زمانگی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس جہاں میں ایسے بھی ہوں جنہیں پامان بن کر ہی زندگی برکرنے میں
ہی لطف ملتا ہو لیکن مجھے یہ احساس رہا گویا لذیذ کھانا پکا کر اس میں کسی نے ریت کا جھار دکھا دیا
ہو۔ پہلے جانے کی ارسو کو میں دل میں دبایا رہتا ہوں اور وہ بظاہر درج بھی جاتی ہے لیکن چھوڑ جوان
سابن کر میرے ہر بنِ نو میں پہنچتا ہے۔ یہ وہ خواہش ہے کہ کم بھی کم بھی جسم انکساری کا روپ دھار لیتے ہے
کبھی فرعون صورت بن کر اس ہو جاتی ہے۔ اپنا سر ملکانے کو ساحل نہیں پاتی تو دوسروں کے دلوں کو
پاش پاش کر جاتی ہے۔ تھک کر تجدہ رین ہونے کیلئے کوئی عجم کوئی بست کوئی ملکی نظر نہیں آتا تو کھانا
کے ہر ہر منظر کے سامنے بھکھتی ہے۔ واقعہ ہے اور سے کہے ہی جاتی ہے۔ یہی کچلی ہوئی منہ بند بخواہش
میری غزلوں کا مصلحت ہے۔ یہی تھی دامن شکست آشنا آرزو میری کشش شے۔

اسی کشتر کے آگے بالآخر صائم کو بھی ستمپار ڈالنے پڑے۔
پتہ نہیں صائم خوبصورت تھی کہ اس کے سینٹ جو تے ان یور، کپڑے منگی دکانوں سے آتے
تھے؟ خدا جانے میں اس کی شخصیت سے مرعوب تھا کہ اس کے باپ کی دولت کا درعب مجھے لے
ڈوبا۔ خدا جانے یہ شعلہ رو دبی پکن کے باول والی صائم کا اثر تھا کہ میں شدید کٹ کے رستے اونچی
سو سائی کا فروشنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ہر کیف میں کئی برس صائم کے خیالوں میں اسی طرح گمراہ
جیسے کوئی میں لگنے والا بُوٹا تازہ ریز رہا کہ تکہے۔ صائم اور میری محبت میں برکشی کی کیفیت تھی۔....
جب دشخیصیتیں مکمل طبق پر مدد ہونے کی صلاحیت نہ رکھیں اور اپنی اپنی اکٹھی کا پکاؤ کرنی تو میں تو
اکھاڑے کی سی محبت جنم لیتی ہے جس میں بچھاڑنے کی آرزو فریقین کی جانب سے ابھر قی رہتی ہے۔
میں چاہتا تھا کہ صائم کھاتے پیتے، اشتعال بیشتر، ہوتے جاتے میرے بغیر اصولی ہو۔ اس کی
ہر خوشی میری ذات سے وابستہ ہے۔ اس کا ہر لمحہ میرے وجود سے آباد ہو۔.... صائم محبت کو فون
کی طرح استعمال کرتی تھی کہ مزدودت پر مٹی تو نمبر ملایا وہنہ جو نکلا کریڈل سے آتا رہتے تھے نہیں سمجھ سکتے۔
صائم نے بہت سارے برس مجھے سے محبت کی پیل MANNERS والی محبت۔ وہ مجھ پر سینما کی میز رد
سیٹ کا آر نکلا کر خود یہ بھول گئی کہ میں اس آر کی وجہ سے ہمیشہ خالی بیٹھا رہا۔

صائم سے محبت کی یہ سال کان کان پانی میں گزرے۔ کئی بار میں نے اس سے رشدی کی
درخواست کی۔ اس نے محبت سے انکار کیا لیکن شادی پر رضا مند ہو گئی۔ کئی بار اس نے شادی سے
انکار کر دیا لیکن محبت کا اقرار گر خوشی سے کرتی رہی۔ صائم کے پاس دراصل معاشی، تعلیمی اندھی
لیے کرنی فرستودہ عظام نہ تے جن کو مضبوط کیے کہ کر متسلط طبقے کے لوگ عموماً زندگی کی راہ سے بیرون
خلنکل کتتے ہیں۔ وہ غربی لوگوں کی طرح نظریں کو شخصی ازاوی کی موت سمجھتی تھی سوہ بیرونی عالم کے
بکول کا جوں میں پڑھی تھی جہاں زوجان طبقہ ماری مراعات حاصل کرنے کے بعد خود کشی کی دلیز
پر کھڑا مسلک رہا۔

صائم کے زو دیک جنسی اور محبت بالکل دوا کا میال تھی۔ برا اگر ساتھ دانتوں ہوں تو گیارہ کے نہے۔

کی طرح مضبوط ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ایسے مکن نہ ہو تو پھر بھی ایک کی ضروریت مسلم رہتی ہے۔ میں مشرق کی فزول میں پدا تھا۔ میں نے پریوں کی کمانیاں پڑھی تھیں۔ میں نے ایسے آور شوں کو پتے باندھ رکھا تھا جو زبانی کلائی غیر فنا فی ہوا کرتے ہیں۔

صائمہ زندگی تھی..... میں خواب تھا۔

اس بین فرق کے باوجود میں دل ہی دل میں صائمہ سے کہتا کہ چہے میرا خدا ایسا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکے میرے دل کے شوالیے میں رہنے دو۔ جس طرح بتر سونے کے کام آتی ہے اور ساتھ ساتھ انہی راؤں میں اس پر آنسو بھی جذب ہوتے ہیں۔ اسی طرح میرا خدا امیر عزادات کی ہر باری بلیدی کو جذب کرنے کی بیسے مزدوری ہے۔ میں اچھا ہوں تو اس سے جدا طلب کر سکتا ہوں۔ گناہ کار ہوں تو اس سے غفرنگ کا طالب ہو سکتا ہوں۔

صائمہ کے پاس حسب الوضع کا دوستی نظریہ نہ تھا کیونکہ اس نظریے کو انسان دوستی ہر پر کر کر تھی اور انسان دوستی اسی لئے بے معنی تھی کہ اگر کوئی رسول تھا نہ خدا نہ کوئی فرزش تھی نہ کوئی راہ شادی اور محبت کو کھلے فتحوں کی طرح تھے۔ صائمہ کی ساری تعلیم نظریوں کے ابتدائی کمانی تھی۔ یہ چھوٹے بڑے سانپ تھے جو ہر وقت ایکدوسرے کو کھانے کی دھن میں مگن تھے۔ بھی بار میرا بھی چاہا کہ صائمہ سے کھوں۔ صائمہ! یہ لوگ ہیں کی تعلیم نہ تم کر شخصی آزادی اور فرد کی ایمت کا اس قدر پکا احساس دلایا ہے جو اجتماعی زندگی کو خاندان کی بقا سے لے کر سو شان کے اجتماع سک انسانی روح کی موت تصور کرتے ہیں۔ مذرا ایک بار غور سے انہی جدوجہد کا اندازہ لگا کہ مجھے جواب دو۔ پچھن ان کا اس سئے خواہ بزرگ رہتے ہے کہ شادی شدہ جوڑے شخصی آزادی کو حق بھجو کر بخوبی کو دار است چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بچے تو پی آئی اس کے امداد سے بھی بدتر حالات میں وقت بر کرتے ہیں جبینیں اگر باپ کا سایہ میر نہیں تو کم از کم ان کی آنحضرت قول جاتی ہے..... جوانی اور بلوغ کا نہد ان کا اس قدر سیجادی، طوفانی اور پتھر باقی گزرتا ہے کہ ایں ایسی طبی سے لیکر جنسی عیاشی کے ہر بیوپر وہ پسے سے تھیسی بنا کر بر قسم کے نشے سے زندگی بھر کیتے غرفہ ہو جلتے ہیں۔ درمیان عمر میں وال آئی

ضعیف الاعتقادی کی لذت سے م Freed ہوتا ہے۔ خامان کی محنتی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ تصویر کرم فرود کا نہیں کی طرح پہنچے ہی را کہ ہو چکا ہوتا ہے۔ بڑھا پا پوشن گھروں میں اگزرتا ہے.... پچوں سے دُور جوانوں سے دُور۔ تعلقتوں سے دُور،

میں صائم سے کھنا چاہتا..... میرے پاس بہت خدا، خامان، ملن کے فرمودہ ہمارے ہنسنے دے۔ میں اس آدمی کی طرح آنکھوں پر پی باندھ کر چینا چاہتا ہوں جوانہ ٹھانیں پر دیکھنا بھی نہیں چاہتا مجھے محبت کے لاغانی خواب پر اعتماد کرنے دے۔ مجھے یقین کرنے دو کہ ہر چیز نے والا مرد اور جانشہ عورت جب ہم آغوش ہوتے ہیں تو یہ ایک اکانی ہوتی ہے گیارہ کاہنڈ سر نہیں ہوتا مجھے اعتبار کرنے دو کہ خدا سب کچھ دیکھتا، سنتا اور افسان کرتا ہے مجھے اپنے ملن کیتے ہجھڑنے دے۔ مجھے اپنے رسول سے محبت کرنے دو کیونکہ صرف وہی ایک مثبت اور ماٹن ثبوت میرے اور میرے رب کے درمیان ہے۔ ایک صائم کا تنفس اس قدر شاستھا۔ دیکھ کر سیپی سے لیکر FREE LOVE ملکے اسکی تاویلیں استقدار تھیں کہ میں اگر نگئے، بہتر نے، اندھے کی طرح اپنا آپ مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیتا۔

وہ مجھے مسلسل بلوچی رہتی..... بلوچی رہتی۔ چاچھ کو بلوتے ہنسنے مکھن نہیں نکلتا صرف سطح پر جھاگ ہی جھاگ پیدا ہو جاتی ہے..... سیکی حال ہرا تھا۔ صائم نے میرے سارے وجود کو جما میں بدل دیا۔ اس کی آغوش میں سر سکے کبھی کبھی میں بہت دوڑنکل جاتا۔

میں سوچتا شاید دنیا کے کیا گرثے میں، افریقہ کے ایک چھتنا بارے جنگل میں کسی گھوٹے پر کمھی پسے بھلتے ہوئے بنان کے کسی گرم تونر کے پاس، میکیکو میں کسی گدھے پر سورا رختانی لیندہ میں سازنگ پہنچے ہوئے، من دربن میں من رہی درخت کے ملٹے تھے کہیں کسی جگہ یہاں دہاں اس کائنات میں ایک عورت میری طرح ہر انسان ہے۔ جب ابھی گھری کے طلاق ایک دن..... کسی معین دن اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آئے گا۔ ہم قرن اور صدیاں ساتھ رہیں گے اور ہمیں ایک دوسرے کے لمحے کی اور کا سماران نہیں پڑے گا۔ اس لمحے کے بعد ہماری اکانی میں ہر تیسرا آدمی غل ہو گا۔ جبیں دل

رُگنے کیلئے دوسرے لوگ، پارٹیاں، سینا گھر، بازار، گالف، میڈی وژن، بیرونی ہائکس سیاحت کے جھوٹے ہمارے نزدیک پڑیں گے۔

جہاں ہم دونوں کی اکاؤنٹ ہو گئی ہے اس الفاظ ہو گا..... امن ہو گا..... امید ہو گی..... ول کو خوش رکھنے کیلئے اسی جنت کا تصور خوب تھا۔ لیکن خدا جانے اسی تصور کو بال بیرنگ کیوں لگے ہوئے تھے۔ بلکے سے دھکے سے کہیں کامیں نکل جاتا۔

صائمہ میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اسے اپنی تعلیم پر پختہ یقین تھا۔ مشکل سادی میرے نے تھی جو چانپے فرسودہ نظریات کو پڑھے، ہوتے باہر ان کی طرح چور نظریوں سے دیکھا کرتا تھا اور ملک طو پران کا ہم خیال بھی نہ ہو سکتا تھا۔

جس روز برسوں کے انتخاب کے بعد میری شادی ہامہ سے ہوئی اسی بعد ہم نے سگریٹ کے لئے کش رُگنے کے جلدی مسی دھوئی سے بھر گیا اور اس دھوئی میں پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میری دم کو نواری نہیں۔ اس بات کا اعتراف اسکے مجھ سے خود کیا.....

"امید ہے آپ اتنے اولاد دفیش آدمی نہیں ہیں جو شادی کے وقت دم کے کنواری ہونے کی آس رُگنے سیئے ہوتے ہیں۔"

صائمہ کے بھی میں نہ بجا جت تھی مذاہماں گناہ مذہمہ میرا منہ چڑھا رہی تھی نہ میری دل کی داری کر رہی تھی۔ وہ بالکل دستوں کی طرح الٰتی پاتی اسے میرے مانے بیٹھی مجھ سے بڑی جسم میں کی توقع رکھتی تھی۔

UNDERSTANDING

حال تک کوواریں کے مغلوقی میں بھی کچھ ایسا کفر نہ تھا لیکن اس وقت مجھے لگا جیسے کسی احمد نے اٹ گاس کا گلدن ٹھرکی کی سلپر رکھ دیا ہوا درود ہوا کے تیو جھونکے سے رٹھا کر فرش پر جا گاہ۔ خدا جانے میرے چہرے میں کوئی بات تھی یا میری سانس نے جلی کھانی تھی اسی لئے صائمہ نے میرا پہنچنے والوں میں تھام کر کما تھا..... سنوا! انسان کی بغاٹی میں ہے کہ ذہن کے درپیچے ہمیشہ کھے بی تاکہ نے دنظریات کی نمازہ اور معطوبوں ان میں سے آتی ہاتھی ہے۔ نظریہ چاہے پوٹیلکل، وغیری ہو

لپکرے تلقی رکھے یا جنس سے بالآخر نظریہ ہوتا ہے اور اس کے لفظی کی ہر وقت لگنچائش رہتی ہے۔ اس کی سوچ سیال ہے زندہ ہے۔ اسکی لئے وقت کا استرا، بخوبی کی ریتی، دوسروں کی سوچ اس کے خیالات کو تراشتی ہے گی۔ مسلسل عل ہے اور نامعلوم طریقے سے جاری رہتا ہے اور اندر سے گئے تنا، سبزی مائل لٹکل آتی ہے پھر چال منخت ہو جاتی ہے پھر اور تنا نکلتا ہے یہ تو یہک

PROCESS ہے مبا زندگی جتنا مbla. :

حاءم کی قدمتی یا میرے تنگ نظریات کی تھی دامنی تھی۔ خدا جانے اس کی آواز کا لوچ تھا متنطق کی روایتی اس روز پہلی بار میں نے محسوس کیا۔ میرے اذٹ ایورسٹ سرکار اور صاحب کے ساتھ زندگی ببر کرنا ایک عبادت ہو۔ اس نے میری گزدن میں اپنا بازو حاصل کیا اور بدلی:

"تم دراصل بچھتے مکونوں میجھے وی ماہشوں سے پڑھتے ہو۔ تم نے شادی محبت اور جنس کا تھوڑا جن سے مستعار یادہ مدل کلاس کی MORALITY کے حامل تھے۔ جنس اور محبت دراصل دو مختلف چیزیں ہیں۔ کبھی کبھی لوگ خاصی کرپڑھ کھجھ جاتا ان دونوں کو بچا کر دیتے ہیں۔ پانی اور رو سکی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ عموماً انہیں ملا کر پہنچنے کے عادتی ہیں۔ سیکس و سکی کی طرح و بنع کو جھٹھ جاتی ہے اور پانی زندگی کی بقاہے۔"

محبت کی طرح سانس کی طرح

یہ وقت بھاگ جلنے کا تھا۔

یہ وقت وہی اور پانی دونوں سے انکار کرنے کا تھا۔

لیکن حاءم نے جو کچھ بھی دیا میں نے بتول کیا اور ایکبار بھی سوال زیکر حاصلہ! جو کچھ تم مجھے سکھا رہی ہو وہ میری پریوں کی کمائی کی لفظی تو نہیں کیا تم تھوڑی دیر کیتے پہنچنے ذہن کا دریک پہنیس کھول سکتیں؟ کیا تم دونوں ہی نظریات کے خاتمیں پوچھ رہے ہی؟ کیا جتنی آزادی تمہیں لپٹنے ملک پر کار بند رہنے کی ہے کیا میں بھی اُڑتے ڈر تے اپنے ملک کیدے ہاتھ اُنہوں اور امید رکھوں کہ میری بھی شواری ہو گی۔ کیا تمہنے دین پر اور میں اپنے دین پر قائم نہ کر ساختہ قدم

نہیں اٹھا سکتے۔ کیا سوچ کی افزادیت مٹائے بغیر ایک انسان دوسرے انسان سے جوت نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے مہاںوں اور طلباء کا پھرہ در پھرہ امید سے روشن ہے۔ بخ سے ایکا باتیں سننا چاہتے ہیں جو ان کے شکوہ رفع کر دیں لیکن کپڑے سے طرح نہ پرانی تعلیم مجروم نہ ہو۔ سائنس کی اس طرح رواداری ہو کر نہ ہب جوانہیں ماں فی آنکھ سے ملا ہے اس کی دل شکنی نہ ہو۔ یورپ کی آزادی مل جائے لیکن مشرق میں خاندان کے تصور اجھ سالمیت ہے وہ برقرار ہے۔ . . . وہ منفی اور مشتبہ کو رکباد دیکھنے کے آزو مند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ فرمکابت قرآنے بغیر دین کی پرستش جاری ہو جائے۔

میں جی ہی جی میں بنتا ہوں۔ تھا کی اگر زمیں لپٹی ہوئی یہ دوپدی میرے سامنے ہے۔ اس کے اوپر نظریوں کی جو ساری بندھی ہے اتنی پسلنی اور بل دار ہے کہ اگر میں صدیاں بھی یہ پیر صن کھوئا رہوں تو انسان کی اصل برہنگی پر ہم سب کی نظر نہ پہنچ سکے گی۔ انسان کا جسم نہیں بلکہ اسکی روح اس کی سائیکی سماں اگ اور پانی سے تشیل ہوئی ہے۔ تقاضو کی تخفی کے لئے میرے پاس کچھ نہیں پر پسپل صاحب کے خط میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا تھا کہ میں عبوری دور کے نوجوان کیلئے ہو مشرق کے پالنے میں پلا اور جس نے مغربی تعلیم پانی ہواں بھوپنگے نوجوان کو صدر کوئی پیغام دوں۔ لیکن میرے پاس ایسا کوئی نظر یہ موجود نہیں ہو تھا کہ ساحلوں پر پل کی اندستوار ہو جائے پر پسپل صاحب کی اگرزو ہے کہ میں پلچر دل کے فرق مٹا کر انسان دوستی کی فضا فائم کر دوں۔ ان کا خیال ہے کہ دنگے نسل کا امتیاز، غرتی ایمیری کا فرق، مختلف زبانوں کے بب و لمب کا بعد جزا فیاضی حدود دراصل ساری نظر باتی اور پہنچ دیتے دقت سطح پر آچھے تھے ہے۔ اندسے نی نوع انسان ایک ہے۔

میں پر پسپل صاحب کی اگرزو میں تو برابر کا شرکیں ہوں لیکن خوب جانتا ہوں کہ اگر نظر یہ باقی نہ رہے۔ اگر یہ رنگ پیدا ہوئی۔ . . . تو غالباً انسان میں نہ کوئی باقی رہے گا اس کے نسبت ہونے کی کوئی سطح باقی رہ جائے گی۔ . . . بچہ انسان فرشتہ بن جائیگا

جو غالباً اس کا مقصود نہیں ہے۔ یکریگی اللہ کی مشیت نہیں ہے۔

میں ایک دفعوں کے بینے کھڑا ہوں۔ سامنے وہ لوگ ہیں جو مجھے ہاتھوں ہاتھ لینے کی نکار میں بیسیں لیکن اس وقت میرا وجہ ایک کتبے کی طرح بالکل تھنا اور سرد ہے۔

مجھے اپنی طرح سے بیا ہے کہ ہماری خالد اسی مٹی سے بنی تھیں جس سے پیر پیغمبر دل کی ماں ائمہ میان بنایا کرتا تھا۔ میں نے انہیں پرے ۲۷ سال کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ انہیں کبھی غصہ نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ اضاف کرتی تھیں۔ کبھی پچھے کی طرف ان کا میلان زیادہ نہ ہوا۔ ان کے سینے پر قفاڈ کی صدیب نہیں لٹکتی تھی۔ مل کے دوپٹے میں ان کا فورانی پھر و دیکھ کر میں ہمیشہ نظریں جھکا کر پھونوں کے بل چلنے لگتا اور میری آواز اندر کمیں گم ہو جاتی۔

میری خالد ہمیں کبھی کبھی پہنچ پر لیجا تی تھی۔

لیکن یہ پہنچ ہمیشہ ایک برستان میں منافی جاتی اور مردوں کے احترام میں ہر کام آہستہ آہستہ

اور چپ چاپ ہو کیا جاتا۔

یہ برستان پہاڑ کے وسط میں واقع تھا اپنے دیوار اور چڑی ہسکے درختوں سے گھرا تھا۔ وہندہ ان درختوں میں ریگتی پھر تی اور بجھی والی مرٹک کے نشخ نشخ نگریزے ہاتھ لگانے پر جیسے بیکے لگتے۔ گوروں کے اس برستان میں زیادہ تر ان لوگوں کی قبریں تھیں جو ۹۰۱۶ کے زمانے میں اچانک جان بحقی ہو گئے۔ اسی جگہ لا روٹیگن کی وہ قبر بھی تھی جس کے گرد اگر دو ہے کی وجہی زنجیر جھکل کی ہوتی میں کھنچتی تھی۔ قبر کے باشی پیلوں میں ایک پتھر بیلا سیدا گر جاتا۔ اسی گرجے کو دیکھو کر خدا جانے کیوں میکبھو کھیل کا خیال آ جایا کرتا۔

بجھی کی روشنوں، ڈیلیبا کے پھونوں اور ان گنت خوبصورت قبروں کے درمیان ایک گلابی نگ کی قبر تھی۔ اس کا نیلگی مرمر جس میں باریک شریانوں جیسے ریشے تھے۔ اٹی سے برآمد کیا ہوا تھا۔ اس کی سطح فارما یا کاٹی طرح پھلسنا اور رنگ کسی یورپین پچک کے ہونٹوں کا سا تھا۔ اس قبر میں استراحت کرنے والی پیٹھی نے بھی اچانک زانے کی رات جان دی تھی۔

میں اس قبر کے اندر اور باہر دونوں بجھے موجود موتا گھے بھیشہ لگتا جیسے اندر و فتن ہونے والی
ذلزلے میں جاں بحق ہونے والی لیدی بھی میں ہوں اور باہر آہستہ آہستہ تھے ملنے والا وجود بھی دراصل
اسی محنت کا ہے جو قبر کے اندر ہے۔ میں کئی کئی گھنٹے اس قبر کے پامنی بیٹھا رہتا۔ یہ آرام کا ہے جو
اپنی گھنٹی۔ اسی میں سو کر لپنے اور پرانسو بھاکر مجھے عجیب قسم کا سکون ملتا۔

لئنے بریں گزر جانے کے بعد ۰۰۰۰۰

اتنا بست کچھ پالینے کے باوجود ۰۰۰۰۰

اس قدر نامور ہونے کے باوصفت مجھے بہت ہار یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی ایک بہت
بڑا قبرستان ہے۔ یہاں لوگ زندہ بھی میں ادا پنچا اپنی قبروں پر کھڑے رو بھر رہے ہیں۔ یہاں زندگی
کے قبرستان میں میں پنکھ منانے آگیا ہوں۔ اپنی گلابی قبر کے پاس کافی پیشے ہوئے تو جو انوں کو چکر
دوں کر زندگی دراصل ڈیلیے کاچھول ہے ۰۰۰۰۰ گلابی سنگ مر منہیں ہے۔

میں کسی کو کیا سکھا سکتا ہوں؟

میں کسی کو کو نہ نظر یہ بخش سکتا ہوں جبکہ میرے اپنے بھن ہوں میں بھیشہ سوکھی شنی گلی ہوئی
ہے۔ مرد و جر اصولوں کے مطابق کار نشیش کا چھول نہیں ہوتا۔ میں نظریوں کی جگہ نہیں روندھکتا۔ میں
نو جوانوں سے ہاتھ دکرنیں کر سکتا کہ اتفاق بالآخر ہلکا ہے ۰۰۰۰۰ فتح بھیشہ حکی ہوئی بسا اور
سائچ کو آپنے نہیں کیوں نکلے میں جانتا ہوں کہ ۰۰۰۰۰

امیری اور غریبی کے فرق نے جتنے دل دھکائے میں ان کی تدافع کب اور کہاں ہو گی؟

کبھی سفید تو میں سیاہ جلد والی قوموں کو بغیر احساسِ گناہ یا احساسِ برتری کے گلے لگا سکیں

گی؟

کبھی ایسا وقت آئے گا کہ کچھ کے تماً فرق مرٹ جائیں گے اور آدمی آدمی کو اس طرح ملے گا جیسے
ایک حاام میں بھی نگلے ہوں۔

نفریات کی یہ لمبی چڑی جنگ جو نسل انسانی کو بلانے ہوئے ہے اتنے سارے لفظوں کو

جگہ کو میں کس طرح دھا کر کی مل سمجھ کر ایک ماچس کی ڈبیا میں بند کر کے ان طلباء کے سامنے پیش کر دوں؟ میں جو صائمہ کا یہ چھوٹا سا نظریہ نہیں سمجھ پایا کہ جنس اور جیرہ ہے اور محبت اور کیفیت کا نام ہے۔ جب میں خود اس قدر تنگ نظری کا شکار ہوں تو اپنے خطبے میں وسیع القلبی کا ثبوت کیونکروں؟ میں صائمہ کے نظریہ کیلئے کوئی انکار کے لفڑا ڈھونڈنے نہیں پاندھیں اس کے نظریے سے اقرار کی کوئی توت بھی اپنے دل میں نہیں ڈھونڈ سکتا۔ میں بہت جاگتا ہوں..... بہت سوچتا ہوں اور اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں کر دل اور جسم کی بھروسے کے دو منجع ہیں اور دونوں کا لفڑا اقبال کمیں نہیں اور پھر کمیں سے میرے عمل کے اندر ہے کھنڈ اداز پوچھتے ہے اور وہ جو پرلوں کی کماں یوں میں لکھا ہوتا تھا اور پھر وہ ہنسی خوشی رہنے لگے اس جمعے کے کیا معنی ہیں؟

انسان کے بڑھنے پھونے کے طریقے اس سے سب سرتیگ چھین لی ہیں۔ یہ ساری قیمت جو زندگی میں سے مول کرتی ہے آگئی کی قیمت ہے لیکن یہ سارے لوگ جو سمجھ سے کسی خاص ٹھوسی نہ ترے نظر کی روشنی مل گئے آئے ہیں۔ انہیں یہ کیا بتاؤں کہ تم نے اگر سوچا تو خوشی کو ما تھے گنو لو گے ... اور اگر خوش ہے سے کا طریقہ سیکھ لیا تو ساری عمر آگئی کی لذت سے نا آشنا رہ گے انہیں میں کیسے بتاؤں کہ تعلیم فقط امتیاز کرنا سکھاتی ہے۔ تہذیب کا آغاز کرتی ہے، شور کو بیدار کر کے بھروسہ دیتی ہے اور جب یہ تسلیث خواہید ہ نہیں بہت تو پھر اسکی بچلنے پھونے لگتے ہے لیکن آہستہ آہستہ خوشی کا ایک ایک پتہ اس کا وجود بھروسہ دیتا ہے۔ اس درسی گاہ میں جہاں تما آنکھ تعلیم کی تلاش میں آئے ہیں۔ میں انہیں کیسے کہ سکتا ہوں کہ دوستو! آگئی کے دروانے سے اپنے آپ پر بند کرو۔ میں ان زبالغ ذہنوں کو کیسے بتاؤں کہ پھر تم اپنی نشوونما کو قطع برمید کر کے لیے درخت بن جاؤ جو جان میں ہوتے ہیں۔ جن کی علیکی سو سال ہوئی ہے لیکن چو جسامت میں بالشت بھر ہوتے میں۔

اپنے خیالات کے چکر پھر ولدے نکل کر میں کہتا ہوں:

"خواتین و حضرات!

تینگ نظری پستول کی وہ گلہ ہے جس کا ایکش اور ری ایکش بالکل برابر ہے تینگ نظری صرف

اگلے کے سینے میں پستول داغ دیتا ہے بکھر یہ گولی اس کی اپنی شفقتیت کو مجروم کر کے نکل جاتی ہے
دوسرا ہے ہدی کا نکٹہ نظر سمجھنے کیلئے اپنا داغ ہمیشہ کھلا رکھیں۔ دوسروں کے مذاہب، لکھر، سایا
اقتصادی، اخلاقی نظریوں کا مذاق نہ ادا یں۔ ہر سکتا ہے کہ سچائی کی ر حق اور بھروسی ہو۔ ... انسان
کی ترقی اور بغا اسی میں ہے کہ دوسروں کے چوتلوں میں کھڑے ہو کر سوچنے کی حادث ڈال لے۔
ہال میں تالیوں کا شور زخمی کبوتروں کی طرح پھر پھر مٹا رہے۔

میری گردن کندھے اور سینے پر صائم کے فتنہ سے گرم آنسو ڈوٹ رہے ہیں۔

میں کسی ایک نظریے کا حاصل نہیں ہو سکتا۔ کبھی اللہ ڈکنیتیں آج ہیرے ذہن پر درٹک دے
رہی ہیں۔ آج میں قبر کے اندر بھی ہوں اور باہر بھی کھڑا سوگ منارا ہوں۔ آج میں جسم نیکی بھی ہوں اور
میرے اندر ناقابل کی بدی بھی پرتوں رہیں ہے۔ آج میں مکن انسان ہوں کیونکہ آج میرے سینے
پر تسلیکی صلیب عین دل کے قریب چک رہی ہے۔

آج میری صائم کی میئے بعد میرے پاس دوٹ آئی ہے اور میں پھر بیفت کی طرح ٹھنڈا گوشہ بن
گیا ہوں۔ اس کے ساتھ اس کا ہونے والا بچہ بھی ہے۔ اس کی بخاری بخاری اداز میرے کان کی لو سے
ٹکر کر سنارہ ہے..... صائم بھی کی رو رکھو میں نے قید کرنا چاہا..... بلکن جس کے جسم کو
میں نے آزاد رہنے دیا وہ صائم کہہ رہی ہے..... میں تم سے کوئی بھوٹ نہیں دوں گل کیونکہ مجھے تم
سے محبت ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ مجھے ہمیشہ قہر سے محبت رہی ہے۔ اب میں تم سے زندگی کا
کوئی راز چھپا کر نہیں رکھوں گی۔ یہ بچہ میرا بچہ جو تمara بچہ کھلاتے گا تمara بچہ نہیں ہے بلکن
تماری شفقت سے مجھے یہی امید ہے کہ تم اسے اہلی باب کی شفقت دو گے۔ تمارا دل شاعر کا دل ہے
کہ ثناں کا دل ہے۔ اس میں انسان کی تھام برائیں بھی جگہ پانی رہیں..... بیاں..... تماء سے
سینے میں وہ ساری نیکی موجود ہے جو انسان کی معراج ہے.....

صائم کے آنسو میری گردن پر میں

- میں جانتا ہوں کہ میں ساری نندگی اس کے بچے سے محبت کروں گا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ

سادی ہی عمر مجھے اس بچھے سے نفرت رہے گی اور میں ساری تکمیر اس نفرت کا اظہار نہ کر سکوں گا
کیونکہ مجھے اپنی محبت اور اپنی نفرت کسی پر بھی کلی یقین نہیں ہے
میں قبر کے اندر بھی رہوں گا اور باہر بھی۔

ایک نوجوان پر و فیسر سپاس نامہ پڑھ رہا ہے۔

ایسے خوش نصیب و گ بہت کم ہوتے ہیں جن کی ہر خواہش کا ناتھ نہ
پوری کرتی ہے . . . دوت اثروت اخترت . . . وہ کوئی چیز ہے جس
سے خدا نے انہیں نہیں فواز دی۔

اوازِ نجھ سے جیسے درج پھر چکی ہے۔

میں گردن جھکائے مرخ کر سی میں ایک نامطلوب مہان کی طرح بیٹھا ہوں۔
میں جب دنیا میں ایسا تو کسی کو خوشی نہ ہوئی۔

اور اب جب میرا بیٹا اس دنیا میں آئے گا تو وہ بھی میری طرح ہی نامطلوب ہو گا۔

اپنے جو دکنِ ناکامی سے یکراپنے بیٹھے کے لاوارثِ جو حقِ گلبائی سنگ مر کی کمی میز لیں
ہیں۔ لیکن ابھی میں اس جسے کو جلد پھوڑ جانا چاہتا ہوں کیونکہ آج میرے نام خوشی کی ایک اور بڑی اتنے
والی ہے۔ اگر اسدا و رسانان کا وقت ایک سا ہوتا تو خوشی کی بوگیاں بیٹھتے وقت پڑاتیں۔ پارسلوں پر
صدیوں پہلے مرکھ پ جانے والے بے نیل دلام اوسیوں کے نام و روح نہ ہوتے لیکن اب تو مددیاں
پہنچنے کئے ہوئے پارسل کو چھڑانے جانا ہی پڑتا ہے۔ دیکھنے میرے نام کی بخشی میں سے لڑکا لختا
ہے یا لڑکی؟

دیکھنے اسی نہ ولود کے سینے پر قضا کی سلیب جو قبے کرنے ہیں؟



ان کی غمگین جد سے جدا نہ کی خوبصورتی ہے۔ موت کی ٹھنڈی باس احتیا ہے۔
 آمد سے پہلی ملاقات نیل کے کنارے ہوئی تھی۔ میں اپنے دلک و اپس آرام تھا اور
 وہ اپنے ہسپانیہ لوٹ رہی تھی۔ مسجد قرطبہ کے عقب میں رہنے والی آنڈا جگ کے چمپی سینے
 پر پلاٹینمی صلب آؤ رہا تھا دہاری ملاقات چند روزہ تھی۔ بادام کے شکوفوں کی طرح حطر
 بید نازک اور اپنی مرث کے اساس سے لرزان۔ اس شام ہم دونوں ہوٹل سے اٹھ کر نیل
 کے ناسپاں پانیوں میں فاتلے آئیں تھے۔ اندھیراست مدھی کی طرح دبے پاؤں اگے بڑھ
 رہا تھا اور تاہرہ شہر کی بیان نیل کے ناسپاں پانیوں میں فانوس روک جل بھر رہی تھیں۔ ان منعکس
 بیوں کو دیکھ کر ہسپانیہ کی وخت نے کہا تھا :

”اُصف! ان بیوں کا اپنا تو کونی وجود نہیں — نہیں ہے نال۔“

”کسی بیوں کا آتما۔“

”تجو بیان آپ نیل کے سینے سے آگئی ہیں۔ میلوں افاصدہ طے کر کے۔“

”نہیں —“

آمد اونا چاری تھی۔ جادو گرفتی تھی۔ اس کا بیوں ویسا رسیس پلاٹی دیوار کی طرح نہست
 سے ناکشنا تھا۔ اس میں کارمن کی روح تھی۔ وہ مسجد قرطبہ کی طرح خوبصورت اور جادو کافروں تھی
 لیکن نوجوانے اس روز ہما مے قیام کی آنڑی شام کو شمع روکیوں قطہ قطہ گپٹل رہی تھی۔ اس
 کی متوا ناک ضبط کئے ہوئے آنکھوں کے باعث ٹیڑھی نظر آرہی تھی اور سینے کی چمپی میں
 ڈلی ہرنی آہوں نے زبردسم کا نام تو سزا رہا تھا۔

”اس میں ان بیوں کا بھی تو کوئی نصویر نہیں جو ناہرہ میں جل رہی ہیں — ہے نا —“

مرد ہر لمحہ مجرات میں بزدل بن جاتا ہے۔ وہ کچھار میں پناہ لینے والے شیر بتر کی اندھہ سویا
 رہتا چاہتا ہے۔ مجھ پر بھی اس وقت بزدلی طاری تھی۔ کوئی چیز فضائیں ایسی تھی جو ناما فوس تھی جو
 بکوں کی خوبصورتی سے مشابہ لکھن عطر حنا میں پڑ گیں غبار سے کی طرح اور اٹھ رہی تھی۔ شام کا انو

پن کی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔ مجھے... لگ رہا تھا... میں نہیں ہوں — اور پھر بھی کسی پر بیٹھا ہوں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں، میرا کوئی امی نہیں — میرا حال بھی سائے کی اندھے جس کا پانپا کوئی وجود نہیں — میں اس کیفیت سے ڈرتا تھا جیسے اپریشن ٹیبل سے بجاگ کسی مظلوم پر بلا مقصد گھوڑا ہوں اور میرے صرپہ میرے جسم، میری شریاؤں میں کلور و فارم کافر شان شان کر رہا ہے۔

”میری بات کا جواب دو آصف!“

اس کی بات کا ایک بھی جواب تھا کہ میں چینے سے اٹھتا اور نیل کے پانیوں کا پانی غیر مری حساس اور کلور و فارم سے بد ہوش جسم پر درکردیتا۔ لیکن میں نے اپنی بزدلی کو سببی ٹھٹھولیں چھپائی ہوئے کہا — ”سید محی بات کیا کرو۔ محبوسیں آنے والی۔ ہر وقت کامن بننے کی کوشش نہ کیا کرو۔“

اس نے منہ پھیر دیا۔ نیل آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے وہ بولی: ”جو خواہ مخواہ کسی کا علس اپنے دل میں ڈال لیں اور اسے چھپائے رکھیں۔ . . . وہ بیوقوف ہوتے ہیں نا۔“

”خدا کیلئے اتنی خوبصورت شاہ کو تباہ نہ کرو۔“

لیکن آنڈا کے اپنے وجوہ کے اندر ختمی پناہ گرد رہا تھا۔ اس کے اندر شکست و ریخت کا ایک طوناں موجود تھا۔ وہ شیامِ بلک لمبیں کیا پرواہ تھی، بھرک کر بولی: ”اگر نیل ان بتیوں کو اپنے پانیوں میں یوں بسانا چاہتا ہے تو اس میں شہر کی بتیوں کا کیا قصور؟“

”تمہیں کیا ہو گیا ہے آنڈا۔“ میں نے ڈستے ڈستے پوچھا۔

دھکی دھی دیور پر امام کلکشم گارہی تھی۔ ہر تباہ میں نے سیل اللہ افی سیل اللہ کی البتاخی میرے اور گرد رکھیں چھڑایاں، ان کے سچے بیٹھے ہوئے لوگ، ان میں کھمنے پھرنے والے ہیرے چڑھ کی ماں کی طرح گھوتے نظر آ رہے تھے۔ آنڈا ایم دا آنکھوں میں چھماق کے نسولے بولی: نماں سخت

پھول کی کہانی سنی ہے تئے:

”میں — اور میں سننا بھی نہیں چاھتا۔ میری ایک روز جو نبی کہانیاں سنایا کرتی ہے میں کبھی ان کے گھر نہیں جاتا۔“

”ہماری سنتھ کی کہانی فلمی نہیں ہے۔“ اصفہ۔ یہ تو دکھ کے پھول کی داستان ہے — اسی پھول جس میں محبت کا مدفن تھا۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میری وقت مدافعت جواب دے کچی تھی۔ سارے میں زمانی ہواں کی سیلیاں بیک رہی تھیں۔ چون کی ماں گھوم رہی تھی اور ام کنفوم الہتکار رہی تھی — رو رہی تھی۔ فی سبیل اللہ — فی سبیل اللہ۔

اکٹھا اپنے آپ سے بولی — ”کہتے ہیں کہ دیوتا اپا لو کی درستی ایک یونانی نوجوان سے تھی۔ ہماری سنتھ نامی یہ یونانی نوجوان حسن میں بے مش نہ تھا۔ انگور کے پتوں کا تابع پہنے اخزوٹ کی لکڑی کی کان سنبھالے چھتے کی کھال میں بلوس جب وہ پہاڑیوں ساتر تا تو یونانی کی دو شیراں پانی بھرنا بھول جاتیں۔ خود اپا لو — سورج کی طرح پاک جھینکے بغیر اس کی طرف سکتا چلا جاتا۔ لیکن ایسا نہ اور ہماری سنتھ کی درستی چند روز نہ تھی۔ اپنی موت کے احساس سے ٹوڑ رہا۔ یہ بتاؤ!“ اصفہ ہر خوبصورت چیز، ہر مکمل طاپ چند روزہ کیوں ہوتی ہے — کیوں ہوتا ہے۔ بتاؤ ناں؟“

میں چپ رہا۔ میری عائینت اسی میں تھی کہ میرے منزہ سے کچھ نہ لٹکے۔

”سو اصفہ۔ ابھی ہماری سنتھ اور اپا تو پر محبت کی اولین سرشانی طاری تھی کہ ہماری سنتھ نش اتر بلنے پر — یعنی دونوں ہیسے کون سا بڑا المین ہے؟“

نیل کے پانی گنبد گونج بن کر میرن ٹاف ٹرھے۔ میں جلدی سے انخادر اس کی کرسی پر جگک کر بولی — ”یہ میری آخری شاکر ہے پر دیک میں — اسے یوں مخفی نہ کرو۔“

آڈی بازار چلیں :

وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر لوئی — تبھی کہا کہتے ہو کہ مشرق کے لوگ دل کے معاملے
بستر کر جائیتے ہیں :

میں اس کے طعنے کا تھوڑا تیر کھا کر بیٹھی گیا اور وہ بولتا چالی گئی : ہانی سنتھ کی قبر
اپا کے اتنے انکو گرے کہ ایک دن قبر سے ایک پودے نے سر زکارا۔ ہوئے ہوئے اس میں
شاخیں نکل آئیں اور میرا ایک پھول کھلا۔ ارغوانی رنگ کا — ہانی سنتھ کا پھول — جب اپنے
دیسیں لوٹ جاؤ تو یاد رکھنا کہ آمدنا کو ہانی سنتھ کے پھولوں سے عشق خداشتی —
میں نیل کے پانیوں میں جملانا تیقیوں کا قرض دیکھنے لگا — ارغوانی بتیاں —
آسمانی بتیاں — گندم پھولوں کی قطاریں — آمدنا ایک چھوٹی سی سکلی سینے کے
پھولوں کی پڑیوں میں ایک چھوٹا سا زلزلہ آیا اور وہ میرے لندھوں پر دو فوٹ ماقدر کھر کر بولی —
جلانتے ہو، ہانی سنتھ کی پنکھہ دلیل پر کیا لکھا ہوتا ہے — جلتے ہو اصفہانیں —

اس کے ہاتھوں کا دباؤ شکنخی کی طرح بوجھل بھی تھا اور آسمان میں تیرنے والے پر کی ماندہ —
ہنکا بھی —

ہانی سنتھ بچھتا دے کا پھول ہے۔ مجت کام فن ہے۔ اس سے جدائی کی خوبیوں آتی ہے
اس میں تھناویں کا لامو جملانا تھے۔ اس کی ہر پنکھہ ٹرپ پر لکھا ہوتا ہے افسوس — سدا افسوس —
اس کی انکھوں سے دوچھٹے سے اتنو پچھللاتے ہوئے مجھ پر آن گرے۔

جب میں پاکستان آؤں گی تو مجھے تباہ محل دکھاؤ گے ناں :

میں نے اس کے گرہیلان میں رٹکی ہوتی صلیب کو چوکر کیا — تباہ محل حضورستان میں
ہے آمدنا — تمیں اپنا ہمسفر بدلا پڑے گا بار ڈر پر —
آمدنا نے اب تک حضور اپنا ہمسفر تماش کریا ہو گا زری — یہ تم ہی تھیں کہ جس میں

سفریات کا حوصلہ نہ تھا۔ ورنہ راستہ چلپے جاں گل بھی سکن اسی راہ میں اور اپنے پا بھی ملتے ہیں۔ آئندہ اکامیری زندگی سے ایسا ہی تعقیل تھا جیسے پوچن کی رضابی کتابوں میں زنگین تصویروں کا وجود۔ ان تصویروں کا تعلق اصل متن سے صفحی ہوتا ہے۔ اسی طرح آئندہ امیری زندگی میں آئی اور چل گئی۔ ایک طرح ستدہ رُخ بھی امیری زندگی میں اصل مقنون ہیں ہے۔

جب بھی بارش آتی ہے زری اور بوندی گرم ٹھیک سے پیٹ کر سوندھی خوشبو میں بیگ جاتی ہیں میں تم کو ہمیشہ یاد کرتا ہوں۔ تم اس خوشبو کی طرح تھیں۔ اونچی انجانان۔ گرم اور سرد کے باہم اتصال کی خوبصورت دلیل۔ آج شاہی سے باطل چلتے ہوئے ہیں۔ بکلی ان سیاہ بادولوں میں بھرا ہی پھرتی ہے۔ پلے آسمان پر ایک سفید چادر لہراتی۔ پھر مشرق کی جانب سے اوری نیلی سیاہ ساڑھوں کے تھان اڑا کر نکلے اور بہت جلد ان پکڑ سے کے تھانوں نے غفت ادنی تنبو کو حصہ شکل اختیار کر لی۔ اس تنبو کی طبا میں ابھی یہیں ٹور پر کسی بھی زندگی تجسس لہ جا بھا غauf پکڑ میں شکاف آگئے۔ میز اس طرح برسا۔ جیسے کھلی عورت میکہ یاد کر کے رو دے۔ بارش کو دیکھ کر متاری یاد کا گھٹاٹوپ اندھیرا میں پاروں طرف چلانے لگا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ بڑی کے گرم وجود سے پیٹی ہوئی ٹھنڈی بوندوں کی خوشبو اٹھی۔ کچڑاں کم طرف اور پیٹے ہوتے ہیں۔ ان میں محبت کا مشکلہ جب غشت غشت تو گھونا ان کا بودھنی کا نہذ کی طرح چھت جاتا ہے۔ کچھ کھلیتے محبت پھر نے اور اتر نے کا موقع ہوتا ہے۔ وہ اپنی بنتے ہو ایں نموادیں مارتے ہیں۔ کچھ طفیل زادے محبت کے نہ رانے کو خوکریں مارا کر کچھ گھردے کی طرح بے و دھت کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی فروعوں میں سیرا شمار بھی تھا لیکن اس رُخ سے ملنے کے بعد نہیں۔ اس وقت بخچے محبت اور محبت میں بھروسی دنوں کا احسان پوری طرح ہو چکا تھا۔

جب میں نے پہلی بار قمیں دیکھا تو متارے میں پر دلبی لمبی پوٹیاں تھیں جن میں بل دیئے ہوتے رُخ دن گرڈھ کے پھریوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ متارے پیروں میں فیٹ بُٹ،

کافوں میں گول سخنی رہنگ اور کندھے پر سکول یونیورسٹی کا صرخ دوپتہ تھا۔ تمہارے گال پکے ہوئے سیبوں کی طرح شلگھ فوری ہو رہے تھے۔ اس سخنی میں کسی آگزین ڈائنس یانازے کی آمیر خش نہ تھی۔ اور پولے اب پر لپیٹ کے چھڑے چھڑے قطعے تھے۔ یہی پسیئی کسی معمورت کی بد صورتی کی وجہ پر سکتا تھا لیکن تم پر یہ صحت اور تازگی کا انتہا رکھتا۔ آنکھوں کے دونوں جانب دنبالہ دار سورمہ تھا۔ بھلگتے تیر کی طرح پر انشان اور تیز رو۔

یہ عرضتی وہاشتی کی عمر نہ تھی۔ یہ عمر سو دواڑا تین ڈالپیں اور آٹھ کریم کی عمر تھی۔ تم اگر چونکم منہ میں چوری کو نہ کر جست قیمتیں میں لیکاتی باقی باقی کہ کر میرے پاس سے گزر جاتیں تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ لیکن تم آکر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ تم نے نہ اپنی عمر پر ترس کھایا۔ اسی مشکل راہ پر نظر کی جو تم نے اپنے لئے لٹکوں میں اختاب کر لی تھی۔ لیکن تم پر تو خبط اچلا۔ اور تم میری محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ تمہاری طرف سے یہ پہلی نظر کی محبت تھی ساس میں استافی جی سے والاد عشت کا دیوانہ پن بھی تھا۔ باپ سے دلی شیفٹلی بھی تھی اور ایک اور چیز بھی تھی جسے مرد تم ہی سمجھتی تھیں جو صرف تمہاری ہی رگ جان تھی۔

”یہ صاحب گھر پر ہیں جے بنی؟“

بے بن کے بہوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ڈیڈی نہیں ہیں جی۔ مگی ہیں اندر۔“

”تو انہیں جا کر بتائیئے کہ آصف تو زیر آیا ہے۔ آصف تو زیر یاد رہے گا ہا۔“

”جی آصف تو زیر صاحب۔ یاد رہے گا جی۔“

پھر تم جالی کا دوسرا دھوکا کا دندن بھاگ گئیں۔ گلیری میں تمہارے بھاگنے کی اوہ آتی رہکہ اسی عمر میں بھاگنے کتنا نظری اور خوبصورت فعل ہے۔ ہرن کی قلنچوں سے متشابہ عربی گھوشے کی جست کی طرح بے خوف پیتے کی طرح سڑک جنم کو فضائیں تو نتے ہوئے بھاگن۔ یہ نہیں بھاگنا۔ نہ تھا۔ پسے کھاتی گئیں کاملا دُڑنا تھا۔ چند ہی لمحوں میں تم داپک بھی آگئیں۔